Fikr-o-Nasar (Islamabad) 15:5-6 (1977)

111

علامہ اقبال سے متعلق
خصوصی انٹرویوز

— ایم ایس ناز

© Dr Muhammad Hamidullah Library, IIU, Islamabad. http://iri.iiu.edu.pk/

غلام احمد پرویز

س: علامه اقبال سے آپ کی پہلی اور آخری ملاقات کب اور کہاں ہوئی ؟ صحبتیں جو گزرگئیں، ان کی یاد تازہ کیجئے ۔

ج: پہلی ملاقات کے متعلق تو متعین طور پر نہیں کہہ سکتا کہ کب اور کہاں ہوئی ؟ اس لئے کہ وہ تو پچاس سال سے بھی زائد کا عرصہ ہے آخری ملاقات البتہ ان سے جنوری ۱۹۳۸ء میں ہوئی، جب یوم اقبال، کی تقریب کے سلسلے میں دھلی سے ہمارا قافلہ لاھور آیا اور ان سے ان کی قیام گاہ پر ملاقات ہوئی ۔ اس زمانہ میں یوں کہئے کہ وہ گویا بستر مرگ پر ھی تھے ۔ بینائی بھی بہت کمزور تھی، بولنے میں ان کو بڑی تکلیف ھو رہی تھی، لیکن اس کے باوجود انہوں نے خاصا وقت ھمیں دیا ۔ میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ کچھ میری رعایت برتی، اس لئے کہ ھمارے صاحب کاروان علامہ اسلم جیراجپوری علیہ الرحمہ تھے، ان کے اکرام و احسان کی بدولت ھمیں بھی یہ سعادت نصیب ھوگئی ۔ خاصا وقت اس میں صرف ھوا اور یہ آخری ملاقات ھے جو حضرت علامہ علیہ الرحمہ سے ھوئی ۔ باقی رہے تاثرات، تو محترم سید نذیر نیازی صاحب نے اپنی کتاب ''اقبال کے حضور میں،، اس دن کی صحبت کا تفصیلی نقشہ پیش کیا ھے ۔ اس سے معلوم ھوجائے گا کہ ھم ان سے کس قسم کے سوال . . . . . ؟

سوال تو میں نہیں کہہ سکتا، میری حیثیت تو ان کے سامنے ایک ادنیٰ سے متعلم کی رہی، ھم تو استفادہ ھی کرتے تھے، جرأت کر لیتے تھے

کچھ پوچھنے کی، اگرچہ وہ بہت جرأت دلایا کرتے تھے، حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے، ان کا تو انداز ہی ایسا تھا وہ کبھی یہ محسوس نہیں ہونے دیتے تھے کہ وہ کوئی بڑی شخصیت ہیں اور ان کے سامنے کچھ چھوٹے لوگ بیٹھے ہیں، وہ تو سب کو برابر کی حیثیت دیتے تھے اور بعض اوقات تو انکسار اور بھی بڑھ جاتا تھا، جو ہم لوگوں کے لئے حوصلہ افزا ثابت ہوتا تھا۔

س: پرویز صاحب! اقبال کے حضور میں اس وقت کوئی ایسا موضوع بھی زیر بحث آیا ہو، جس کا ذکر نذیر نیازی صاحب نے اپنی کتاب میں نہ کیا ہو؟

ج: میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ یہ سوال اس میں آگیا ہے یا نہیں، لیکن دو باتیں بڑی اہم ہیں، حضرت علامہ نے 'جاوید نامہ، میں مختلف ارواح یا مختلف ہستیوں سے عالم بالا میں ملاقات کی جو روئداد بیان کی ہے، میرے نزدیک حضرت سید احمد شہید علیہ‌الرحمہ اور ان کا معرکہ بالاکوٹ، ہمارے اس آخری دور کی اسلامی تاریخ میں بڑا پر عظمت ہے، سو میں نے اس موقعہ پر حضرت علامہ سے عرض کیا کہ جی چاہتا تھا کہ آپ سرسید اور سید احمد شہید، دونوں کی ارواح کو آمنے سامنے لاکر ذرا اس کا تقابل بتاتے۔ اس پر حضرت علامہ نے فرمایا ''یہ اور اس قسم کے اور کئی سوال تھے جو بعد میں میرے ذہن میں آئے اور ایسا ہوجاتا ہے، اب جب بھی مجھے فرصت ملی میں ان چیزوں کو ضرور سامنے لاؤں گا،،

اور ایک سوال، میں نے یہ عرض کیا کہ یہ جو قیامت کا واقعہ یا حقیقت ہے وہ ہمارے ذہن میں تو ہے کہ ہم انسان ایک دن اللہ رب العزت کے حضور پیش ہوں گے، لیکن قرآن میں تو ہے کہ تیرا خدا اور اس کے

ملائکہ یہاں آئیں گے تو کیا یہ سارا ساجرا یہاں ہی ہوگا ؟

انھوں نے کہا کہ حیات بعد ممات اور وہاں کے جتنے بھی نظریات ہیں، ان سب کے متعلق میرے ذہن میں ہے اور میں قرآن کریم کی تفسیر کی (introduction)میں اس سوال کو موضوع سخن بناؤں گا۔

س۔ حضرت علامہ کی صحبت میں جو ان کے شیدائی بیٹھتے تھے، وہ کس قسم کے سوال کرتے تھے ؟

ج۔ (مسکراتے ہوئے) یہ شیدائیوں کی بھی مختلف نوعیتیں اور قسمیں ہیں، آپ کا استفسار ہے کہ ان کے ہاں کس قسم کے لوگ بیٹھتے تھے ؟ ان کی کیفیت تو بڑی دلچسپ ہے ۔ حضرت علامہ چونکہ ڈاکٹر مشہور تھے ۔ تو ایک دفعہ ایک شخص نے آکر سوال کیا کہ میرے پیٹ کا درد بڑا پرانا ہے، کسی حکیم یا ڈاکٹر سے فائدہ نہیں ہوا، آپ مجھے کوئی اچھا سا نسخہ لکھ دیجئے ۔

(قہقہہ لگاتے ہوئے) تو صاحب حضرت علامہ تو یہ بھی بتادیا کرتے تھے اسی طرح مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک مرتبہ موچی دروازے کا ایک جفت ساز ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا : ہمارا کاروبار پہلے خوب چلتا تھا، مگر جب سے انگریزی جوتے مارکیٹ میں آگئے ہیں، ہمارا کاروبار ٹھپ ہوکر رہ گیا ہے، کسی نے ہمیں بتایا کہ علامہ صاحب بڑے اچھے مشورے دیتے ہیں، سو میں آپ سے مشورہ لینے کے لئے حاضر ہوا ہوں ۔

غرض کہ یہاں سے لے کر یورپ کے بڑے بڑے بلند پایہ مفکروں تک حضرت علامہ کی مجلس میں آیا کرتے تھے ۔ ہر کوئی اپنی اپنی ذہنی سطح، افتاد طبعیت اور مزاج کے مطابق سوال کرتا تھا اور اس کو اس کے مطابق ہی جواب ملتا تھا ۔ ادیب، شعراء، فلاسفر اور خود مولوی

صاحبان (مسکراتے ہوئے) پیر پرست لوگ بھی — کئی ایسے بھی تھے جو آکر کہا کرتے تھے کہ حضرت کسی طرح سے آپ ڈاڑھی رکھ لیں، تو پھر دیکھیں کہ دنیا کیسے آپ کی گرویدہ ہو جاتی ہے۔ شیدائیوں اور سوالات کی تو یہ کیفیت ان کی محفل میں ہوتی تھی۔

س : بعض لوگ حضرت علامہ کو ڈاڑھی رکھنے کا مشورہ دیتے تھے، لیکن حضرت علامہ نے ایسا نہیں کیا!

ج : علامہ اقبال ان سے کہا کرتے تھے کہ بھئی اس وقت تک عام تاثر یہ ہے کہ دین کے متعلق وہ ہی کچھ کہہ سکتا ہے یا جان سکتا ہے، جس کی ایک خاص شبیہ ہو، خاص وضع قطع ہو، اور یہ ہمارا جو نیا طبقہ، نئی نسل یا نوجوان طالب علم ہیں ان کے دلوں میں یہ (complex) سا پیدا ہوگیا ہے، میں اس (complex) کو دور کرنا چاہتا ہوں، کہ نہیں، تم بھی دین کو سمجھ سکتے ہو، تمہیں بھی دین کے متعلق معلومات حاصل ہو سکتی ہیں اور اس کے لئے میں اپنے آپ کو بطور ایک مثال کے پیش کرنا چاہتا ہوں کہ دیکھئے میری وضع قطع ایسی نہیں ہےلیکن اس کے باوجود تم جانتے ہو کہمجھے دین کے متعلق بہت کچھ معلوم ہے، یہ دنیا کہتی ہے اور علماءکرام بھی اس کا اعتراف کرتے ہیں، پس اس(complex)کو نکال دو کہ جب تک تمہاری ایک خاص وضع قطع نہ ہوگی تم دین کا علم حاصل نہیں کر سکو گے یا دین کے متعلق کچھ نہیں جان سکو گے۔

س : اقبال کے افکار کی وسعت، ان کی بلندی اور ان کی گہرائی بے پایاں ہے۔ آپ نے علامہ کے افکار کے حوالے سے ان کی شخصیت کے کس پہلو کو زیادہ نمایاں طور پر محسوس کیا؟

ج : میں قرآن کا طالب علم ہوں اور قرآن ہی کی کشش سے میں حضرت علامہ

کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انھوں نے قرآن کریم کے متعلق جو کچھ کہا اس کا میرے دل پہ بڑا اثر تھا اور اثر یہ ہے کہ قرآن کریم کا سمجھنا میں نے حضرت علامہ سے سیکھا تھا۔ ان کی شخصیت کا یہی پہلو تھا جو مجھے ان کے قریب لے آیا۔ انھوں نے اپنی پہلی تصنیف ''اسرار خودی،، یا ''رموز بیخودی،، کے آخر میں کہا ہے کہ جو کچھ میں نے سمجھا ہے، اپنی بصیرت کے مطابق قرآن ھی سے سمجھا ہے۔ قرآن کریم کی عظمت اور اس کا احترام میرے دل میں بھی چونکہ بدرجہ نہایت تھا، اس لئے میں جو ان کے قریب ہوا، تو اس کی یہی وجہ تھی۔ باقی چیزیں وہ قرآن کے تابع رکھتے تھے مثلاً دنیا بھر کے علوم پر ان کی نگاہ تھی، لیکن کسی علم یا مذہب کے متعلق جو بحث بھی وہ چھیڑتے، آخر میں وہ قرآن کی طرف آجاتے اور فرمایا کرتے تھے کہ قرآن اس کے متعلق یوں کہتا ہے۔ میرے نزدیک ان کی شخصیت کا سب سے نمایاں اور جاذب پہلو ان کی یہ بصیرت قرآنی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر ان کی شخصیت کو سمٹایا جائے، تو ان کے افکار کی وسعت، ان کی بلندی اور ان کی گہرائی، سب کچھ اس میں سمٹ کر آجاتا ہے۔

س علامہ ایک مستقل نظام فکر رکھنے والے معاشرہ کی تشکیل چاہتے تھے، ان کے نزدیک اس مثالی معاشرے کے خدو خال کیا تھے ؟

ج : ہاں، یہ وہ سوال ہے جس میں حضرت علامہ کا سارا پیغام سمٹ کر آجاتا ہے۔ در حقیقت قرآن سے پہلے پوری دنیا میں مذہب کے متعلق تاثر، خیال اور عقیدہ یہ تھا کہ یہ خدا اور بندے کے درمیان ایک نجی تعلق (private affair) کا نام ہے جو پوجا پاٹھ ، پرستش، بندگی اور عبادت کے ذریعے سے قائم ہوتا ہے یا مراقبوں اور ریاضتوں کے توسل سے، دنیاوی معاملات سے ان کا کوئی تعلق نہیں، مگر قرآن

حکیم نے آکر اس کی تردید کی اور بتایا کہ نہیں، ایسا ہر گز نہیں، ضمناً مذہب کا لفظ تو قرآن میں ہے ہی نہیں، اس میں دین کا لفظ ہے، ہماری یہ بدبختی ہے کہ قرآن حکیم یا عربی زبان کے یہ جو الفاظ ہیں، ان کے مترادفات دنیا کی کسی بھی زبان میں نہیں ہیں، جب ہم ان کا ترجمہ کرتے ہیں تو ان زبانوں میں جو (concepts) یا تصورات ہوتے ہیں وہیں سے ہم یہ الفاظ لیتے ہیں، اس لئے ہم نے دین کا مترادف مذہب (religion) لیا۔ جو صحیح نہیں ہے۔ قرآن یا اسلام درحقیقت مذہب کے خلاف ایک چیلنج ہے۔ حضرت علامہ بھی جو کتاب لکھنا چاہتے تھے اور جس کے لئے وہ (Notes) چھوڑ گئے، انھوں نے ایک فقرے میں یہ کہا ہے کہ:

''اسلام (religion) کے خلاف (protest) ہے''

صد حیف کہ اقبال وہ کتاب لکھ نہ سکے۔ میں یہ کہنے کی جسارت تو نہیں کر سکتا کہ میں نے ان کے موضوع کو اپنایا، بہر کیف یہ ان ہی کا فیضان ہے کہ میں نے Islam, a Challenge to Religion لکھی۔ اس میں شک نہیں کہ اسلام مذہب کے خلاف ایک چیلنج تھا مذہب کا جو تصور (concept) رہا ہے کہ دنیوی معاملات سے اس کا کوئی تعلق نہیں، قرآن نے اس کو غلط ثابت کیا ہے۔ بنابریں وحی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ دنیوی امور کو ابدی اقدار کے تابع رکھ کر حل کرے۔ حضرت علامہ نے اسے ایک مصرعہ میں یوں سمودیا ہے کہ ع

از کلید دیں در دنیا کشادہ

دین کی چابی سے دنیا کے ہر دروازے کو کھولا جا سکتا ہے۔ اور یہی ہے دین اسلام کا کام، قرآن نے ہمیں یہی سکھایا ہے۔ اب جہاں تک دنیوی امور کا تعلق ہے، ان میں مملکت کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ دینوی امور دراصل مملکت ہی کے ذریعے طے پاتے ہیں،

گویا اسلام وہ ہے جس میں مملکت اقدار خداوندی کے تابع رہ کر دنیوی معاملات کا حل پیش کرتی ہے اس میں مذہب اور سیاست الگ الگ نہیں رہتے بلکہ ایک ہو جاتے ہیں۔ حضرت علامہ اس بارے میں اتنے محتاط تھے کہ انھوں نے لکھا ہے :

''میں تو یہ کہوں گا اور تمہیں یہ بھی نہیں کہنا چاہیے کہ : یہ ایک حقیقت کے دو رخ ہیں،،

مقصود حضرت علامہ کے کہنے کا یہ تھا کہ دو رخ ہونے میں بھی کچھ ثنویت (dualism) کا تاثر آجاتا ہے اس لئے کہ ع

گوہر میں آب گوہر کے سوا کچھ اور نہیں

بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ میں عرض کروں گا کہ جب اسلام میں ملوکیت درآئی تو اس نے آکر پھر یہ ثنویت پیدا کردی۔ مملکت، سلطنت اور دنیا کے معاملات حکومت نے اپنے پاس رکھ کر ایک الگ دائرہ قائم کر لیا۔ مذہب کے معاملات انھوں نے علماء کو دے دئے، اس طرح سے دو علیحدہ علیحدہ مملکتیں قائم ہو گئیں، جنھوں نے باہم معاہدہ کر لیا کہ وہ ایک دوسرے کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کریں گے۔ اس طریق کار سے وہ تصور ابھر آیا، جو اسلام سے پہلے رائج تھا اور جس کو مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا۔ ہمارے ہاں ہزار برس سے یہی تصور چلا آرہا تھا، ثنویت چونکہ حکومت اور مذہبی پیشوائیت دونوں کے لئے مفید تھی، اس میں دونوں کو الگ الگ اقتدار کے دوائر حاصل تھے، اس لئے حکومت نے تو اس کو مستحکم سے مستحکم تر کرنا ہی تھا، مذہب پرست طبقے نے بھی ہمارے ہاں ان گرہوں کو اور زیادہ مضبوط کیا، چنانچہ کیفیت یہ ہوگئی کہ اذہان

نے اس بات کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ مملکت اور مذھب یکجا ھو سکتے ھیں، حضرت علامہ کا یہ زندہ جاوید کارنامہ تھا کہ انھوں نے فرمایا ۔ ع

جدا ھو دین سیاست سے تو رہ جاتی ھے چنگیزی

حضرت علامہ واشگاف انداز میں فرمایا کرتے تھے کہ قرآن کی رو سے اسلام ایک نظام زندگی ھے، ایک ضابطہ حیات ھے، جو انسانی زندگی کے تمام گوشوں کو مستنیر کرتا ھے ۔ عبادت، مناصب، اور امور مملکت کو اس سے الگ نہیں کیا جاسکتا اور یہ اسی صورت میں زندہ ھو سکتا ھے کہ اپنی ایک آزاد مملکت ھو۔

س : حضرت علامہ کے ذھن میں کس قسم کے مستقل نظام کا نقشہ تھا ؟

ج : وہ ابدی حقائق، اصول یا اقدار، جو خدا کی طرف سے ودیعت کئے گئے، وھی مستقل اور غیر متبدل ھیں۔ حضرت علامہ نے یہ تصور دیا تھا کہ آپ ان مستقل اقدار کو بطور حدود کے لیجئے، یہ غیر متبدل رھیں گی۔ ان حدود کے اندر رہ کر بھی زمانے کے تقاضوں کے مطابق جزوی قوانین یا اس کے جزوی پروگرام کی جزئیات، ھر دور کی امت باھمی مشاورت سے خود متعین کرے گی، اس طرح سے یہ غیر متبدل اور تغیر کے امتزاج سے زمانے کے ساتھ ساتھ بلکہ زمانے کی امامت کرتا ھوا نظام آگے بڑھے گا۔ مستقل نظام کی یہ ایک شکل ان کے ذھن میں تھی ۔ اقبال، قرآن حکیم کو اللہ تعالی کی آخری کتاب سمجھتے تھے، ان کا ایمان تھا کہ اس کتاب کو قیامت تک کے لئے محفوظ رکھا گیا ھے ۔ اس کے معنی یہ ھیں کہ قرآن قیامت تک امت کی ھر سیاست، مملکت اور امور دنیا کا ایک دستور اساسی رھے گا، اس اعتبار سے یہ ایک مستقل نظام ھوا، لیکن جو اس کی جزئیات ھیں، وہ زمانے کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ بدلتی چلی جائیں گی۔ بالفاظ

دیگر مستقل اور تغیر پذیر عناصر کے استزاج سے یہ نظام بنتا ہے۔ مستقل نظام کا یہی نقشہ حضرت علامہ کے ذہن میں تھا۔ یہ تصور انھوں نے قرآن سے لیا اور یہی قابل عمل تصور تھا۔ اقبال چاہتے تھے کہ برصغیر میں مسلمانوں کی ایک الگ مملکت ہو، جس میں اس نظام کو نافذ کریں اور اس کی جزئیات کو ممکن العمل بنائیں، اور اس کے جو انسانیت ساز نتائج ظہور پذیر ہوں، انہیں دیکھ کر پہلے مسلمان مملکتیں غالباً اور اس کے بعد دنیا کی دوسری اقوام بھی اس کی طرف لپک کر آجائیں گی۔

س : اقبال کے ذہن میں اسلامی نظام کا کیا تصور تھا ؟

ج : اس زمانہ میں سب سے بڑا اعتراض یہ پیدا ہوا تھا کہ مسلمانوں میں اس قدر فرقے ہیں جن کی موجودگی میں ایک اسلامی مملکت، ایک اسلامی نظام یا ایک اسلامی دستور پر متفق ہونا کیسے ممکن ہے ؟ علامہ اقبال اس کے جواب میں فرماتے تھے :

''ٹھیک ہے، فرقوں کی موجودگی میں جانتا ہوں، لیکن ان سب کے اندر قرآن ایک قدر مشترک ہے ؟ اگر ان کی اساس قرآن ہوگی، تو اس سے کوئی بھی انکار نہیں کرے گا ،،

'' فکری روابط کی بڑی اہمیت ہے ، ان حضرات (ائمہ کرام ، جنھوں نے فقہ مرتب کی) نے اپنے اپنے وقت میں بڑا کام کیا ہے۔ میں اس کی قدر کرتا ہوں، لیکن اس تمام ہمہ گیری کے باوجود یہ قانونی ضوابط بالآخر انفرادی تعبیرات کا مجموعہ ہیں، اس لئے انھیں حتمی اور قطعی سمجھ لینا غلط ہے،،۔

حضرت علامہ کہتے تھے کہ یہ پچھلے حالات تھے، مگر اب حالات بدل چکے ہیں اور دنیائے اسلام ان تمام نئی قوتوں سے دو چار اور متأثر ہے، جو زندگی کے مختلف گوشوں میں فکر انسانی کی نشو و ارتقاء سے

وجود میں آگئی ھیں، اس لئے مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اس قدامت پرستانہ ذھنیت کو باقی رکھا جائے — اس لئے انھوں نے کہا کہ :-

''خود قرآن کی یہ تعلیم کہ حیات ایک ترقی پذیر عمل ارتقاء ھے، اس کی مقتضی ھے کہ — — —''

یہ ھیں وہ الفاظ جو بڑی اھمیت رکھتے ھیں :

''ھر نئی نسل کو اس کا حق ھونا چاھئے کہ وہ اپنی مشکلات کا حل خود تلاش کرے۔ وہ ایسا کرنے میں سلف کے علمی سرمایہ سے رھنمائی لے سکتی ھے، لیکن اسلاف کے فیصلے اس کے راستے میں رکاوٹ نہیں بن سکتے۔''

حضرت علامہ اقبال کے چھٹے خطبے میں ،جس کا ایک اقتباس میں نے سنایا ھے، اس کی تفصیل ملتی ھے۔ یہی وہ عملی طریق یا پروگرام ھے، جس کی رو سے وہ اس سر زمین کو اسلامی نظام کا گہوارہ دیکھنے کے متمنی تھے۔

س۔ اقبال نے جس جہان نو کا خواب دیکھا تھا۔ کیا ھم اس کے مطابق صحیح رخ پر آگے بڑھے ھیں ؟ اگر نہیں تو کیوں ؟ اس خواب کو حقیقت میں بدلنے کے لئے ھمیں کیا کرنا چاھئے ؟

ج۔ پیش رفت تو درکنار، ھم بہت پیچھے چلے گئے ھیں جیسا کہ پہلے بھی کہا گیا ھے کہ ۱۹۳۰ء میں جب حضرت علامہ نے یہ تصور پیش کیا تو کہیں سے کوئی آواز نہ اٹھی تھی۔ ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۰ء تک قائداعظم جب اس تصور کو لے کر آگے بڑھے تو بیم و رجا کا عالم تھا، اس زمانے میں مخالفت کچھ سطحی سی تھی اس کے بعد جب یہ تصور عملی صورت اختیار کرنے لگا تو مخالفت نظریاتی ھوتی چلی گئی اور اس میں

تندی و تیزی اور تلخی بھی آتی چلی گئی۔ بالآخر پاکستان معرض وجود میں آگیا سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ مملکت کیا تھی؟ یہ تصور کیا تھا ؟ یہ عمل کیا تھا ؟ یہ عمل، یہ تصور اور یہ مملکت ثنویت کو مٹانے کے لئے تھی۔ پاکستان میں اقبال کے تصور کا اسلامی نظام اسی صورت میں قائم ہو سکتا تھا کہ یہ ثنویت باقی نہ رہتی۔
اس میں کلام نہیں کہ اسلام کسی انسان کو کسی دوسرے انسان پر حکمرانی کا حق نہیں دیتا، اقتدار کی کوئی بھی شکل ہو، اسلام انسانوں پر اقتدار کو ختم کر دیتا ہے۔

اگر پاکستان میں اقبال کے تصور کی مملکت معرض وجود میں آجاتی تو مذہبی پیشوائیت کی یہاں کوئی گنجائش نہ رہتی، حکمران طبقے نے اپنے دور کے سیکولر نظام یہاں رائج کئے۔ نام تو سارے اسلام کا لیتے رہے، کیونکہ اسلام کے نام پر دس سال بلکہ اس سے بھی زیادہ یعنی ۱۹۳۰ء سے جنگ لڑی تھی، اب یہ کس طرح ممکن تھا کہ یہ لوگ اسلام کا نام لئے بغیر اپنے مقاصد کو عملی جامہ پہنا سکتے۔
یہاں مجھے اجازت دیجئے کہ درمیان میں کہیں ''میں،، آجائے، جس سے میں ہمیشہ گریز کرتا رہا ہوں، میں طبعاً کچھ ایسا واقع ہوا ہوں، لیکن بعض دفعہ ؟ع بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر۔

افسوس، اقبال نے جس جہان نو کا خواب دیکھا تھا، وہ پورا نہ ہوسکا۔ مگر میں مایوس نہیں ہوں۔ اقبال نے وہی کچھ کہا جو قرآن نے کہا ہے اور ہمارا تو ایمان ہے کہ اس نظام (اسلام) نے دنیا کے ہر نظام پر غالب آکر رہنا ہے۔ اگر ہم شروع ہی سے نوجوان طبقے بالخصوص طلباء کے نصاب ہی سے اقبال کو لازم کر دیتے تو آج ہمیں قنوطیت کا شکار نہ ہونا پڑتا۔ اب بھی اگر یہ انتظام ہو جائے تو اقبال کا تصور

نئی نسل کے رگ وریشے میں سما سکتا ہے۔ میں تو اقبال کے اس تصور کو، اس پیغام کو عام کرتا رہوں گا، یہ میرے ایمان کا جزو ہے، یہ میرے دین کا فریضہ ہے۔ آخر میں، میں عرض کروں گا کہ علی‌گڑھ یونیورسٹی قائم ہوئی، تو پاکستان کی مملکت معرض وجود میں آگئی، اگر یہاں بھی ایک ایسی درسگاہ قائم ہو جائے اور اقبال کے تصور کو نصاب کا حصہ بنا دیا جائے، تو اقبال نے جس جہان نو کا خواب دیکھا تھا، وہ شرمندہ تعبیر ہو سکتا ہے۔ (ہاں) ۔ حضرت علامہ نے فرمایا تھا۔

''زود یا بدیر یہ سوال مسلم اقوام کے سامنے آنے والا ہے کہ اسلامی قوانین شریعت میں ارتقاء کی گنجائش ہے یا نہیں؟ اصل مسئلہ یہ ہے۔ یہ سوال بڑا اہم ہے اور بڑی ذہنی جدو جہد کا متقاضی، اس سوال کا جواب یقیناً اثبات میں ہونا چاہئے، بشرطیکہ اسلامی دنیا اس کی طرف عمرؓ کی روح کو لے کر آگے بڑھے،،

اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ اقبال کے پیغام اور ان کی فکر کو عام کرنے کے لئے ہم کہاں تک آگے بڑھے ہیں؟ اور اگر نہیں بڑھے تو کس سمت کو جا رہے ہیں۔ درحقیقت مخالفین اقبال کی خواہش ہے کہ ع

ہو نہ جائے آشکارا شرع پیغمبر کہیں

اس دور میں جس کو شرع پیغمبری یا نظام اسلامی کہا جاسکتا ہے وہ تو اقبال کے تصور سے پیدا ہوتا ہے، (اور اب) ہم آہستہ آہستہ وہاں تک پہنچ گئے ہیں کہ مذہبی پیشوائیت جس کا دائرہ ابتدا میں مذہب تک محدود تھا اب سیاست میں بھی در آیا ہے، حالت یہ ہوگئی ہے کہ ہم آگے نہیں بڑھے، بلکہ بہت پیچھے چلے گئے ہیں، اور ہماری یہ کیفیت تاریخ کے کسی دور میں بھی نہیں ہوئی کہ مذہب پرست طبقہ سیاست کے اوپر آکر حاوی ہو جائے۔

س ۔ کیا یہ بات نہیں کہ اقتدار ہمیشہ ان لوگوں کے ہاتھوں میں رہا، جو مذہب سے بیگانہ تھے اور صرف سیاست جانتے تھے؟ اس لئے اگر یہ تجربہ بھی دیکھ لیا جائے تو کیا مضائقہ ہے؟

ج ۔ مگر میری ذاتی رائے میں اگر انتخابات میں ایسا ہوا، تو ہوسکتا ہے، مذہبی طبقہ اس فکر میں ہے کہ اقبال کی فکر آگے نہ آئے ۔ حکمران طبقوں کے مفاد میں بھی یہ بات ہے کہ سیکولر نظام ہی رہے ۔ سرمایہ دار طبقہ کی بھی یہی خواہش ہے، کیونکہ یہ ان کے مفاد میں ہے، اقبال اور قرآن سرمایہ داری کے مخالف ہیں ۔

(یہ سب گروہ) فکر اقبال کے مخالف ہیں کیونکہ یہ طبقے نہیں چاہتے کہ یہاں اسلامی نظام رائج ہوجائے ۔

س ۔ تو پھر اقبال کی فکر کو عام کون کرے گا؟

ج ۔ جس کو جرأت نصیب ہو گی، وہی اقبال کی فکر کو عام کرے گا ۔ ایسی جرأت جو اللہ تعالی نے حضرت عمر فاروق رض کو بخشی تھی، بقول اقبال:

"وہ عمر رض جو اسلام کا سب سے پہلا تنقیدی اور حریت پسند قلب ہے وہ جسے رسول اللہ صلعم کی حیات طیبہ کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی جرأت نصیب ہوئی کہ ہمارے لئے اللہ کی کتاب کافی ہے"

جرأت کے فقدان کے بغیر اقبال کا تصور یا پیغام عام نہیں ہو سکتا ۔ جرأت کے بغیر یہ تصور، یہ پیغام یا تو شاعری ہو جائے گا یا پھر قوالوں کی ڈھولک پر گایا جائے گا ۔

ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال

س۔ آپ علامہ کے افکار کے حوالے سے ان کی شخصیت کے کس پہلو کو زیادہ نمایاں طور پر محسوس کرتے ہیں ؟

ج۔ اس میں کلام نہیں کہ علامہ کے افکار کی وسعت، ان کی بلندی اور گہرائی بے پایاں ہے اور ان افکار پر اظہار خیال کرنے کے لئے تو بہت سا وقت چاہئے، تاہم میں سمجھتا ہوں کہ علامہ کی فکر کے ان گنت پہلوؤں میں سے پانچ پہلو سب سے نمایاں ہیں، ان کی فکر کا اولین پہلو برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں سے متعلق ہے، جسے ایک لحاظ سے ان کی فکر کی ابتدا کہا جا سکتا ہے۔ علامہ اس خطہ کے مسلمانوں کے مسائل کو حل کرنا چاہتے تھے، انہیں یہ احساس تھا کہ برصغیر میں مسلمانوں کی تعداد خواہ ہندوؤں سے کم ہی کیوں نہ ہو، مگر بعض ایسے خطے ہیں جہاں ان کی تعداد ہندوؤں کی بہ نسبت زیادہ یا بالفاظ دیگر ان کی اکثریت ہے، یہی وجہ ہے کہ سر سید کے بعد علامہ اقبال ہی تھے، جنھوں نے فکری طور پر محسوس کیا کہ مسلمان ایک الگ قوم ہیں۔ اس سلسلے میں اگر حضرت علامہ کے اوراق حیات پیش نظر ہوں، تو پتہ چلتا ہے کہ جونہی وہ انگلستان سے لوٹتے ہیں، غالباً جولائی ۱۹۰۸ء میں تو اس کے بعد ان کی جو تحریریں منصۂ شہود پر آتی ہیں، ان سب سے مترشح ہوتا ہے کہ اقبال براہ راست مسلمانوں سے اور خالصتاً مسلمانوں سے مخاطب ہوتے ہیں، پھر اسرار خودی اور رموز بیخودی کا دور آتا ہے

اور اس سارے دور کی تکمیل ۱۹۳۰ء کے خطبہ الہ آباد پر ہوتی ہے ، اس پس منظر میں اقبال کو مصور پاکستان کہنا، ان کی فکر کا ایک پہلو ہے، جس کا تعلق ان کے سیاسی فلسفہ سے ہے، جو قیام پاکستان پر جا کر منتج ہوتا ہے۔

پاکستان کا قیام ہی اقبال کا منتہائے نظر نہ تھا کہ مسلمانان ہند کو ایک علیحدہ خطہ زمین وطن کے طور پر مل جائے بلکہ یہ ایک طرح کی اس اسلامستان کی بنیاد تھی، جو ان کی نگاہ میں موجود تھا اور وہ دنیائے اسلام کو متحد دیکھنا چاہتے تھے۔ میری رائے میں یہ ان کی فکر کا دوسرا نمایاں پہلو ہے، جس کا تعلق اتحاد عالم اسلامی سے ہے۔ اس ضمن میں ان کا تخاطب پاک و ہند کی سرحدات سے پار نکل جاتا ہے، غالباً اسی وجہ سے انہوں نے فارسی میں اشعار کہنا شروع کئے، کیونکہ یہ ہمیشہ مسلمانوں کی تمدنی زبان سمجھی جاتی رہی ہے۔

حضرت علامہ کی فکر کا تیسرا نمایاں پہلو دراصل ان قوموں کے نام ایک پیغام ہے ، جو مغلوب تھیں یعنی جن پر مغربی اقوام کا تسلط تھا اور آجکل کی اصطلاح میں جس کو تیسری دنیا کہا جاتا ہے، اس کا اظہار ان کی تصنیف ''پس چہ باید کرد اے اقوام شرق،، سے ہوتا ہے ان مغلوب قوموں کو اقبال نے یہ پیغام دیا کہ اپنے قدموں پر کھڑی ہوں اور مغرب کی اندھا دھند تقلید کرنے کی بجائے اپنی انا (خودی) پر انحصار کریں، اقبال کے نزدیک یہی ایک طریقہ ہے، جس سے وہ صرف سیاسی آزادی ہی نہیں، بلکہ تمدنی اور اقتصادی آزادی سے بھی متمتع ہو سکتی ہیں۔ علامہ اپنے اس پیغام میں کہتے ہیں کہ مغلوب قومیں مغربی استبداد کے شکنجے میں اس لئے جکڑی ہوئی ہیں کہ ان کے کچھ

اپنے نقائص ہیں، اور اس معاملے میں صرف نوآبادیاتی طاقتوں اور استعماری قوتوں کو ہی مورد الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

فکر اقبال کا چوتھا پہلو میری نگاہ میں پھر ایک اعتبار سے پیغام ہی ہے، یہ پیغام متمول اقوام کے نام ہے، اقبال انھیں اس بات کا احساس دلاتے ہیں کہ اے متمول اقوام، اگر تم انسانیت میں تفریق روا رکھو گے اور کالے اور گورے انسانوں میں فرق اور ترقی پذیر اور ترقی یافتہ ممالک میں تمیز کرتے رہو گے، تو تمہارا نام صفحہ ہستی سے مٹ جائے گا اس بنا پر اقبال نے ہمیشہ تلقین کی ہے کہ انسان کو انسان کا احترام کرنا چاہئے۔

آدمی صد احترام آدمیت

یہ ان کی فکر کا بہت نمایاں پہلو ہے، اسے ایک لحاظ سے (world view) کہا جائے تو مضائقہ نہ ہوگا کیونکہ اقبال کا جو بین‌الاقوامی تصور ہے یا جس کی بنا پر ان کی فکر کی بین‌الاقوامیت کا انحصار ہے، وہ یہی ہے کہ جب تک آدمی آدمی کا احترام کرنا نہیں سیکھے گا اس وقت تک کوئی بہتر دنیا وجود میں نہ آسکے گی۔

اقبال کی فکر کا میری نگاہ میں پانچواں اور آخری نمایاں پہلو ان کا آفاقی نقطۂ نگاہ یا انسان کے متعلق ان کا وہ آفاقی تصور ہے، جس کے تحت وہ انسان کو خدا کے بالکل قریب لاکر کھڑا کر دیتے ہیں۔ جس طرح قرآن حکیم میں ہے کہ خدا ہی انسان کا خالق نہیں بلکہ خدا کے علاوہ بھی اس کے کچھ اور ''خالق'' ہیں، اس روشنی میں اقبال کہتے ہیں کہ اگر ایک انسان اپنی خودی کو مستحکم کرلے تو وہ خدا کا 'ہم کار' ہوجاتا ہے اور اس کے ساتھ تخلیق کائنات میں حصہ

لے سکتا ھے ۔ گویا تقدیر کائنات میں رنگ بھرنے کو اقبال بنی نوع انسان کا حق یا فرض سمجھتے ھیں اور ایک بہتر کائنات اور ایک بہتر نظام کی تشکیل میں اس سے خدا کا ھمکار بننے کی امید رکھتے ھیں ۔

س ۔ عصر حاضر کے تقاضوں کے پیش نظر، آپ ان پانچ پہلوؤں میں سب سے زیادہ کسے اھمیت دیتے ھیں ؟

ج ۔ سب سے روشن پہلو جو مجھے بے حد عزیز ھے ،وہ حضرت علامہ کا آفاقی نقطۂ نگاہ ھے، جس میں وہ انسان کو رجائیت کا ایک ایسا سبق دیتے ھیں کہ وہ محسوس کرنے لگتا ھے کہ خدا اس سے ساوراء نہیں، بلکہ اس کی شہ رگ سے بھی قریب ھے اور اگر انسان اپنے آپ میں یہ صلاحیت پیدا کر لے تو وہ قطرے سے گہر بن سکتا ھے ۔ میرے نزدیک ان کی فکر کا ماحصل بھی یہی ھے ۔

س ۔ ڈاکٹر صاحب ! آپ نے فرمایا ھے کہ علامہ اقبال نے عالم اسلام کے اتحاد کو فروغ دینے کے لئے اس وقت کے مسلمانوں کی تمدنی زبان یعنی ''فارسی،، کو ذریعہ اظہار بنایا، کیا یہ بھی حقیقت نہیں کہ انھوں نے عجمی مسلمانوں کو جس میں بر صغیر پاک و ھند کے مسلمان بھی شامل ھیں، اتحاد و یگانگت کا درس اردو شاعری میں دیا، مثلاً

ایک ھوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاک کاشغر

ج ۔ آپ نے درست فرمایا، میں نے صرف اس زمرے میں ذکر کیا ھے کہ فارسی زبان میں حضرت علامہ نے محض اس خاطر کتابیں لکھیں کہ یہ زبان اسلامی تمدن کی زبان شمار کی جاتی تھی اور اس کے علاوہ ھمارے

ھاں یہ روایت بھی تھی کہ اس وقت اسلام کے تمدنی پہلو پر اگر کچھ لکھا جاتا تو زیادہ تر فارسی میں لکھا جاتا تھا ۔ مثلاً مولانا روم گو ترکی الاصل تھے، لیکن ان کا کلام یا جو ان کی مثنوی ھے وہ فارسی زبان میں ھے ۔

س ۔ اقبال کا پیغام nut shell میں کیا ھے؟

ج ۔ یہ سوال میرے نزدیک بڑا اھم ھے، کیونکہ اس کا تعلق براہ راست اقبال کی شخصیت اور ان کے افکار سے ھے ۔ میں نے عرض کیا ھے کہ علامہ کی فکر کے پانچ نمایاں پہلو ھیں، مگر یہی پانچ پہلو ان کی فکر کا پرتو نہیں ھیں ۔ چونکہ اقبال کے افکار کو بحیثیت مجموعی سمجھنے کا سلسلہ ھمارے ھاں ابھی پوری طرح سے جاری نہیں ھوسکا ۔ اس بنا پر بعض لوگوں کو اقبال کی فکر میں تضاد نظرآتا ھے اور وہ کہتے ھیں کہ اقبال کی فکر میں ایک صورت ''وہ،، بیان کی گئی ھے اور دوسری صورت ''یہ،، ھے مگر ''وہ اور یہ،، کے چکر میں آنے کی بجائے ھم یہ نہیں سوچتے کہ اقبال کی فکر کا مجموعی تاثر کیا ھے ۔ اس مجموعی تاثر کو اقبال کا پیغام کہا جا سکتا ھے ۔

اس موقع پر میں ایک مثال سے اپنے مافی الضمیر کو بیان کرنا چاھتا ھوں اور وہ یہ ھے کہ آپ ایک ھیرے کو لیں جس کے مختلف پہلو ھوتے ھیں ۔ یہ مختلف پہلو مختلف اقسام کی روشنی منعکس کرتے ھیں، اب اگر کوئی یہ کہے کہ ھیرے کے فلاں پہلو سے زرد روشنی نکلتی ھے اور فلاں سے سرخ روشنی، اس وجہ سے یہ تضاد و تفاوت ھے، تو میری نظر میں ایسا کہنا غلط ھوگا، کیونکہ ھمیں تو دیکھنا یہ چاھئے کہ ھیرے کی بحیثیت مجموعی آب و تاب کیا ھے اور اس کی

جگمگ کیسی ہے فکر اقبال کو سمجھنے کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ شاعر مشرق کے پیغام کو بحیثیت مجموعی سمجھا اور پرکھا جائے، کیونکہ ان کی فکر کے صرف ایک پہلو پر توجہ دینے سے، دوسرے پہلو نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں اور پھر اس کا لازمی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ اقبال کا پیغام nut shell میں ہمارے اذہان و قلوب سے دور رہتا ہے ۔ ہم عقل کے ذریعہ شاعروں کی فکر کی طرف رجوع کرتے ہیں، یہ بھی درست ہے کہ عقل اپنا ایک پارٹ ادا کرتی ہے، لیکن شاعروں کا تعلق بالخصوص عقل کے ساتھ نہیں ہوتا، درحقیقت شاعر کی نگاہ ہمیشہ قاری کے دل پر ہوتی ہے اور اقبال تو دل کا پجاری ہے ۔

س ۔ آپ کا اشارہ شاید اقبال کے ان اشعار کی طرف ہے، جس میں انھوں نے دل کو عقل پر فوقیت دی ہے مثلاً

جو عقل کا غلام ہو، وہ دل نہ کر قبول

یا

عشق تمام مصطفے عقل تمام بو لہب

ج ۔ بجا ہے، میں یہ مصرعے دہرانے ہی والا ہی تھا ۔ در اصل فکر اقبال بھی عقل کی متقاضی نہیں، بلکہ دل اور عشق کی طلبگار ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اقبال کا پیغام nut shell میں یہی ہے کہ ہر انسان دوسرے انسان کا صدق دل سے احترام کرے ۔

س ۔ کیا یہ درست ہے کہ اقبال ایک مستقل نظام فکر رکھنے والے معاشرہ کی تشکیل چاہتے تھے ؟ آپ کے خیال میں اقبال کے اس مثالی معاشرہ کے خدو خال کیا تھے ؟

ج ۔ اس کی ایک واضح صورت حضرت علامہ نے ''اسرار و رموز'' میں پیش

کی ہے۔ یقینی طور پر ان کے سامنے ایک مثالی معاشرہ تھا، جس کو وہ تشکیل کرنا چاہتے تھے۔ اقبال چونکہ اسلام سے بالخصوص متاثر تھے، اس لئے ان کی نگاہ میں فرد یا معاشرے کا جو تصور تھا، وہ اسلام کی رو سے ایک کامل تصور تھا۔ اس ضمن میں اگر میں یہاں سرسری طور پر تصور خودی یا اسرار خودی کا ذکر کروں، تو بیجا نہ ہوگا۔ اقبال کہتے ہیں کہ اطاعت قانون کے جذبہ ہی سے انسان کی خودی مستحکم ہوسکتی ہے اور اس سلسلے میں قانون سے ان کی مراد قانون شریعت ہے اور اس کی اطاعت کے معاملے میں وہ ارشاد فرماتے ہیں کہ صحیح قسم کے جبر سے صحیح قسم کی آزادی پیدا ہوتی ہے، اگر انسان پہلے اپنے آپ کو کسی طرح سے جامع جبر کے قالب میں ڈھال لے، تب ہی وہ صحیح معنوں میں آزاد ہونے کے قابل ہو سکتا ہے۔

اقبال کی نگاہ میں دوسری منزل ضبط نفس ہے، جس سے ان کی مراد یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو جاننے کی کوشش کرے، خصوصاً اپنی کمزوریوں کو بخوبی سمجھے تاکہ ان پر حاوی ہو سکے۔ اقبال کے نزدیک ضبط نفس ہی ہے جس سے انسان یا فرد اس تعلق یا فاصلے کو سمجھ سکتا ہے، جو قانون یعنی قانون شریعت اور عمل کے درمیان واقع ہے۔ اس لحاظ سے اطاعت قانون کے بعد ضبط نفس، ایک انسان یا فرد کو اس کی خودی کو مستحکم بنانے کے مقام تک رسائی کے لئے بہت ضروری عنصر ہے۔

تیسری منزل اقبال کی نگاہ میں نیابت الہی ہے۔ یہ منزل بقول علامہ اقبال اس وقت انسان کو حاصل ہوتی ہے، جب وہ قانون شریعت سے کماحقہ آگاہ ہو جاتا ہے اور صرف اس پر ایمان ہی نہیں رکھتا، بلکہ

اس پر عمل بھی کرتا ہے۔ ایسی صورت میں وہ خدا کا ہمکار انسان بن جاتا ہے۔ فرد کی تکمیل ذات ان تین منازل کو عبور کرنے سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد اقبال جب اسرار خودی کا ذکر کرتے ہیں تو ان کی نگاہ میں اس معاشرہ کا تصور ابھرتا ہے، جو کامل انسانوں کے اجتماع سے تشکیل پاتا ہے۔ گویا وہ معاشرہ یا جماعت جو کامل انسانوں کے اجتماع سے بنتی ہے وہ مثالی فرد کی طرح خود ایک unique (مثالی) معاشرہ یا جماعت ہوتی ہے۔ اسی لئے اقبال کہتے ہیں کہ شیطان فرد پر تو حاوی ہو سکتا ہے، مگر وہ جماعت سے ہمیشہ دور بھاگتا ہے۔ اس کے بعد علامہ فرماتے ہیں کہ قرآن حکیم جس طرح فرد کی تکمیل ذات پر زور دیتا ہے، اسی طرح جماعت کی تشکیل پر اصرار کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نماز، حج وغیرہ ایسی عبادات میں بھی فرد کی بنسبت اجتماعیت کا تصور ملتا ہے۔ مقصد میرے کہنے کا یہ ہے کہ علامہ اقبال کے نزدیک جماعت کا جو تصور ہے وہ درحقیقت صحیح اسلامی سوسائٹی کا تصور ہے، جس کو آپ مثالی معاشرہ بھی کہہ سکتے ہیں اور جو افراد کی تکمیل ذات، قانون شریعت، ضبط نفس اور نیابت الٰہی سے تشکیل پا سکتا ہے۔

س۔ اقبال نے جس جہان نو کا خواب دیکھا تھا کیا اس کی تعبیر پوری ہوگئی ؟ اگر یہ خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکا، تو اس کی وجوہ کیا ہیں ؟

ج۔ حضرت علامہ نے جس جہان نو کا خواب دیکھا تھا، افسوس کہ وہ ابھی شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکا اور ہم صحیح رخ کی سمت آگے نہیں بڑھ سکے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم نے اپنے وطن عزیز پاکستان کو ابھی تک محض ایک لیبارٹری (laboratory) بنا رکھا ہے، جہاں ہم مانگے تانگے نظریات کے متعلق آئے روز نت نئے تجربے کرتے

رھتے ھیں، لیکن اقبال نے جس راہ کی نشاندھی کی تھی، اس کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی۔ اس کا سبب شاید یہ ھے کہ ھمارے ھاں کے سیاستدانوں میں اقبال اور فکر اقبال کو سمجھنے کا فقدان رھا ھے۔ برادرم! میں آپ ھی سے سوال کرتا ھوں کہ جب سے پاکستان وجود میں آیا ھے، اس وقت کی سیاسی قیادت یعنی قائداعظم کے انتقال کے بعد سے لے کر آج تک آپ کی نگاہ میں کتنے ایسے سیاست‌دان یا ارباب اقتدار ھیں، جو اقبال شناس تھے۔ میرا ذاتی خیال ھے کہ آپ ایک یا دو کے سوا ایسی کسی شخصیت کا نام نہیں گنوا سکیں گے — سو مشکل یہی ھے کہ ھماری سیاسی قیادت اقبال کے نظریات سے ناآشنا رھی ھے اور اقبال کے افکار کو بطیب خاطر یہاں نافذالعمل کرنے کی کوشش ھی نہیں کی گئی۔

س۔ ڈاکٹر صاحب، آپ کے خیال میں اقبال کے نظریات کو کیونکر عملی جامہ پہنچایا جا سکتا ھے؟

ج۔ جی ھاں! یہی قابل غور مسئلہ ھے — آپ اگر لمحہ بھر کو سوچیں تو محسوس کریں گے کہ پاکستان کے قیام کے سلسلے میں ایک تو سیاسی تحریک تھی، جس کو ''تحریک پاکستان،، کہا جا سکتا ھے۔ مگر ایک اس کے پس منظر میں تمدنی تحریک تھی، جس کا بیج سر سید کے زمانے میں بویا گیا۔ سر سید کی تحریک سیاسی نہیں بلکہ ایک لحاظ سے تعلیمی تحریک تھی، جس میں اسلامی تمدن کا بڑا اھم رول ھے۔ میرے خیال میں سرسید کے زمانے کی اس تعلیمی تحریک کی بنیادیں وسیع النظری پر استوار کی گئی تھیں، جس کو آپ ''لبرل ازم،، (liberalism) کہہ سکتے ھیں، یعنی وہ قدامت پسند طبیعت کے مالک نہ تھے، جس کے لئے آپ

puritanism کی اصطلاح استعمال کر سکتے ھیں — میری رائے میں اقبال اس تحریک کی آخری کڑی تھے۔ ان کا منتہائے مقصود یہ تھا کہ ایک ایسا معاشرہ وجود میں لایا جائے جو اسلامی روایات کے ساتھ ساتھ جدیدیت سے بھی منسلک ھو، یعنی جو وقت کے جدید تقاضوں سے کامل طور پر عہدہ برا ھو سکے۔ یہی وجہ ھے کہ اقبال نے اجتہاد، پر خاطر خواہ زور دیا ھے اور یہاں تک کہا ھے کہ ھر نئی نسل کو فقہ، حدیث اور قرآن حکیم کے اصولوں کو وقت کے تقاضوں اور نئی نئی ضروریات کے مطابق، ان کی تعبیر کا حق حاصل ھے۔ اور پھر وہ 'جاوید نامہ، میں ارشاد فرماتے ھیں کہ کس طرح قرآن حکیم کی ایسی کئی تعبیریں ھیں، جن کا اب تک انتخاب نہیں ھوسکا کیونکہ وہ ایک اعتبار سے آنے والی نسلوں کے لئے مختص ھیں۔ اقبال چونکہ اسلام کو آخری دین اور قرآن کو اللہ تعالی کی آخری کتاب سمجھتے تھے، اس لئے وہ کہتے تھے کہ اس کی جو تعبیریں ھیں وہ اتنی مختلف ھو سکتی ھیں، جس سے ان کا مختلف ادوار پر منطبق ھونا ظاھر ھوتا ھے، لہذا ھر نسل اور ھر دور میں یہ ممکن ھے کہ ھم اپنے مسائل کا حل وقت کے جدید تقاضوں میں تلاش کریں اور اس سلسلے میں باقاعدہ اجتہاد کیا جائے۔ اس میں ملت اسلامیہ اور بالخصوص اس وطن عزیز کے مسلمانوں کا مفاد ھے۔

س۔ اجتہاد کے بارے میں کیا علامہ اقبال کوئی خاص نقطہ نظر رکھتے تھے ؟

ج۔ حضرت علامہ سمجھتے تھے کہ اسلامی ممالک کی جو مجالس آئین ساز ھیں، یہ ان کا کام ھے کہ وہ اس قسم کے اجتہاد کو روبہ عمل لائیں اور مسائل کو قرآن کے جدید تقاضوں کے مطابق حل کریں۔ جس زمانے میں اجتہاد کے دروازے بند کر دئیے گئے، تب کئی ایسے موضوعات

تھے، جنھوں نے انسانیت میں ترقی نہیں کی تھی ۔ اب بعض علوم، علوم جدید اور بعض علوم قدیم کہلاتے ہیں ۔ کبھی وہ وقت تھا کہ علوم قدیم ہی پڑھائے اور سمجھے جاتے تھے، لیکن آج علم کے میدان میں بھی خاطر خواہ ترقی ہوئی ہے اور اس کے کئی نئے شعبے بن چکے ہیں مثلاً سائنس ، ٹیکنالوجی اور اقتصادیات وغیرہ ۔ ایسے علوم جدید کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کام ہمارے فقہاء کا ہے کہ وہ سوچیں کہ اسلام کے دائرہ کار میں رہتے ہوئے موجودہ دور کے مسائل کو وہ کس طرح حل کر سکتے ہیں ۔ یہ صورت تب ہی اجاگر ہو سکتی ہے کہ اقبال کے مثالی معاشرے کو قائم کیا جائے اور اجتہاد کے بارے میں حضرت علامہ کے افکار کو پیش نظر رکھا جائے ۔ اقبال کے نزدیک تغیر جو ہے وہ قدرت کے نظام میں کائنات کی ایک طرح کی تقدیر ہے، اس لئے ہر انسان کو چاہئے کہ وہ اپنے کو اس کا اہل ثابت کرے کہ وہ اپنے حالات بدل سکتا ہے اور خدا سے نئی تقدیر مانگ سکتا ہے ۔ بس اس میں شرط عزم صمیم کی ہے کہ وہ اپنے آپ میں اتنی قدرت رکھتا ہو ۔

س ۔ ڈاکٹر صاحب ! آپ نے فرمایا ہے کہ اقبال کے نظام کو ہم صحیح طریقے سے نافذ نہیں کر سکے یا ان کے نظام کو یہاں پنپنے کا موقع نہیں دیا گیا، سیاسی قیادت کی اقبال ناشناسی کے علاوہ بھی اس کی کوئی وجہ ہے ؟

ج ۔ اقبال کے نظام کو قائم کرنے اور ان کے افکار کو عام کرنے کی ذمہ داری ایک حد تک اقبال کے نام پر قائم ہونے والے اداروں پر بھی عائد ہوتی ہے، مگر افسوس کہ ایسے تمام اداروں کا زیادہ تر کام علامہ کے کلام کے تراجم کرانا رہا ہے یا ان کے نظریات پر کتابیں لکھوانا یا

سال کے سال کوئی تقریب منعقد کرانا۔ ابھی تک تو اس سلسلہ میں جو کچھ ہوتا رہا ہے وہ بقول اقبال ان لوگوں کے ہاتھوں سے جو گفتار کے تو غازی ہیں لیکن کردار کے نہیں — اور میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اقبال کے نظریات کا صحیح نفاذ تو اجتہاد کے ذریعہ ہی ہو سکتا ہے اور اس اجتہاد میں اقبال کے نام پر بننے والے ادارے اور یونیورسٹیوں کے بعض شعبے بھی حصہ لے سکتے ہیں۔

س۔ ادارہ تحقیقات اسلامی میں بھی اس نقطہ نظر سے باقاعدہ کام جاری ہے اور ایک کتاب ''اقبال اور اجتہاد'' کے موضوع پر زیر طبع ہے۔ جس کی تدوین کے دوران یہ سوال ابھرا کہ علامہ اقبال نے ۱۳ نومبر ۱۹۲۳ء کو ''الاجتہاد فی اسلام'' کے موضوع پر لاہور میں ایک خطبہ پڑھا تھا۔ اس کے بعد جب حضرت علامہ حیدرآباد اور مدراس تشریف لے گئے، تو انھوں نے وہاں جاکر اس خطبے کو پڑھنے کی بجائے نئے سرے سے خطبات لکھ کر پڑھے، جب علی‌گڑھ تشریف لے گئے تو انھوں نے یہی خطبہ وہاں پڑھایا۔ حیدرآباد اور مدراس میں اس خطبہ کو نہ پڑھنے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟ دوسرے یہ کہ ۱۹۲۹ء میں علامہ اقبال نے لاہور میں جو لیکچر دیا، کیا یہ وہی خطبہ تھا، جو ۱۳ نومبر ۱۹۲۳ء کو ''الاجتہاد فی الاسلام'' کے نام سے پڑھا گیا تھا۔

ج۔ اس کے متعلق مجھے زیادہ علم نہیں ہے یہ مسئلہ تحقیق طلب ہے۔ البتہ یہ درست ہے کہ حضرت علامہ نے جو لیکچر دئے وہ (Reconstruction of Religious Thought in Islam) کی صورت میں شائع ہوئے، ان میں سے بعض وہی ہیں، جو مدراس میں دئے گئے اور بعض ایسے ہیں جو مدراس میں نہیں پڑھے گئے، بعد میں لکھ کر شامل کئے گئے۔ مثلاً اس میں

ایک The Principle of Movement in the Social Structure of Islam کے نام سے لیکچر ھے ۔ ممکن ھے اس سلسلے میں انھوں نے ایک علیحدہ لیکچر لاھور میں دیا ھو، جس طرح کہ آپ نے سوال اٹھایا ھے، مگر میری معلومات اس سلسلے میں بہت محدود ھیں اور میں اس بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا ۔

س ۔ ڈاکٹر صاحب، کیا ''الاجتھاد فی الاسلام،، کا اصل مسودہ کسی کے پاس محفوظ ھے ؟

ج ۔ میرے پاس تو نہیں، میں نے تو اسے اسی شکل میں دیکھا ھے، جس کا ذکر میں نے مذکورہ عنوان میں کر دیا ھے یعنی Reconstruction of Religious Thoughts in Islam

س ۔ ''اقبال بحیثیت باپ،، کے موضوع پر کچھ کہنا پسند کریں گے ؟

ج ۔ میں نے اس سلسلے میں غالباً ۱۹۴۶ میں ایک مضمون(۱) بھی لکھا تھا ۔ بعد میں اس مضمون میں تھوڑا بہت اضافہ بھی کیا ۔ اس زمانہ میں تو مجھے بچپن کے واقعات اچھی طرح یاد تھے ۔ تاھم اس موقع پر اتنا ھی کہہ سکتا ھوں کہ اقبال ایک شفیق باپ تھے اور مجھ سے ھمیشہ محبت اور شفقت سے پیش آتے تھے ۔ ان کی محبت میں ایک طرح کی سختی بھی تھی ۔ شاید آپ کو اس بات کا احساس ھو کہ انھوں نے میرے نام جو نظمیں یا اشعار منسوب کئے، ان کا تعلق میری ذات ھی سے نہیں، بلکہ نثرادنو سے ھے ، یعنی وہ مجھے ایسا نوجوان دیکھنے کے متمنی تھے، جس طرح مسلمانوں کی نوجوان نسل یا شباب ملت کا تصور ان کے ذھن میں تھا ۔

---

(۱) یہ مضمون انٹرویو کی صورت میں ۲۱ اپریل ۱۹۴۶ کو ریڈیو سے نشر ھوا اور بعد میں ترمیم واضافہ کے ساتھ «مئے لاله فام» میں شامل اشاعت ھوا۔ جو ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال کے مقالات کا مجموعہ ہے ۔

اسی بنا پر ان کی محبت میں میرے لئے کچھ سختی بھی تھی ۔ مثال کے طور پر اگر میں کبھی قمیص شلوار کا کپڑا یا جوتے وغیرہ مہنگے داموں خرید کر لاتا تو وہ بہت خفا ہوتے تھے اور بالفرض انہیں معلوم ہوجاتا کہ آج میں بستر کی بجائے زمین پر سویا ہوں، تو وہ بہت خوش ہوتے ۔ گویا ان کے ذہن میں ایک تصور تھا کہ میں کس طرح کا نوجوان بنوں ۔ وہ چاہتے تھے کہ میں تقریر کرنا سیکھوں، میں کشتی لڑا کروں مقصود تصور ان کا یہی تھا کہ مسلمان نوجوان کیا ہوں اور ان کی بود و باش کا طریقہ کیا ہو؟ ان کے خیالات کس قسم کے ہوں؟ مجھے ان کی زندگی میں یورپین لباس پہننے کی ممانعت تھی اور وہ یہ بھی پسند نہ کرتے تھے کہ میری چھوٹی ہمشیرہ (منیرہ اقبال) اپنے بالوں کو دو حصوں میں گوندھیں اس لئے کہ ان کے نزدیک یہ یہودیوں کا انداز تھا ۔ الغرض اولاد کے متعلق ان کا اس قسم کا زاویہ نگاہ تھا ۔

جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے، جاوید ان کی نظروں میں ایک کنایہ (symbol) تھا، مسلم نوجوانوں کا، نئی نسل کا — وہ جہاں کہیں بھی مجھ سے مخاطب ہوئے، اس سے ان کی یہی مراد تھی کہ وہ نئی نسل کے نوجوانوں سے خطاب کر رہے ہیں ۔ اس لحاظ سے آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ وہ محبت کرنے والے ایسے شفیق باپ تھے، جو کھانے کو تو سونے کا نوالا دیتے تھے، مگر دیکھتے قہر کی نظر سے تھے ۔ اس زمانے میں تربیت کا یہ(concept) تھا کہ ان کے ساتھ آزادی اور بے تکلفی کا ماحول بھی نہ تھا مگر اولاد کی جائز ضروریات کو خواہ وہ خوردونوش کے متعلق ہوں یا لباس اور تعلیم کی، کسی صورت میں نظر انداز نہ کیا جائے ۔

اس ضمن میں آپ کا استفسار ہے کہ کوئی خاص واقعہ بیان کروں، واقعات تو میرے ذہن میں کئی ہیں، جس سے ان کی شخصیت کا کوئی نہ کوئی پہلو مترشح ہوتا ہے، مگر مجھے ان کی زندگی میں استغنا کا عنصر سب سے نمایاں دکھائی دیا۔ جس وقت حضرت علامہ کا انتقال ہوا، میری عمر ساڑھے تیرہ سال کے لگ بھگ تھی، اس مدت میں ابتدائی پانچ سال نکالدئے جائیں، تو صرف آٹھ یا نو سال رہ جاتے ہیں، جس میں میرا اور ان کا ایک طرح سے تعلق رہا۔ یہ بچپن کا زمانہ تھا، لیکن یہ impressionable age تھی، اس سارے عرصہ میں میں نے ان کو ایک مرد قلندر کے روپ میں دیکھا۔ جس انداز میں وہ زندگی بسر کرتے تھے، وہ سادگی اور پرکاری کی ترجمان تھی۔ انہیں اپنے لباس کی فکر دامنگیر رہتی تھی نہ کوئی کھانے پینے کی، بس استغنا کا ایک عالم تھا، جو ہر وقت ان پر طاری رہتا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ زندگی میں صرف ایک بار وہ اس کوٹھی کے اندر کے کمروں میں آئے اور کہنے لگے: اچھا اس طرف بھی کوٹھی کے بہت سارے کمرے ہیں۔ یعنی وہ اپنی زندگی میں اپنے کمرے کے سوا کسی اور کمرے میں نہیں گئے — (اشارہ کرتے ہوئے) اور وہ جو سامنے کے تین کمرے ہیں، یہی ان کے استعمال میں رہتے تھے اور ان کمروں کا کرایہ مبلغ بیس یا تیس روپے باقاعدہ‌گی سے مجھے ہر ماہ کی ۲۱ تاریخ کو پیشگی ادا کردیتے تھے۔ ایک لحاظ سے وہ میرے ''کرایہ دار'' تھے۔ قدرت کا نظام بھی بڑا عجیب ہے کہ وہ ۲۱ تاریخ ھی کو فوت ہوئے اور میرے ذمے ان کی ایک پائی بھی نہ تھی۔

س۔ ڈاکٹر صاحب! کیا آپ کو کبھی خواب میں بھی حضرت علامہ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے؟

ج۔ آپ کا سوال بڑا دلچسپ اور موضوع سے ہٹ کر ہے، تاہم میں عرض کروں گا کہ حضرت علامہ مجھے خواب میں بہت کم ملتے ہیں۔ لیکن عموماً اس وقت ہی نظر آتے ہیں، جب میرے ذہن میں کوئی نہ کوئی لاینحل مسئلہ ہو۔ تب وہ پریشانی کو دور کرنے اور رہبری کے لئے مجھے خواب میں ملتے ہیں — وقت کی کمی کے پیش نظر میں صرف ایک خواب بیان کروں گا۔

تین سال پہلے کی بات ہے، بہت سی ایسی کتابیں میرے زیر مطالعہ تھیں جن کا تعلق حضرت علامہ کے سلسلہ اجداد سے تھا اور میرے ذہن میں ایک سوال بار بار ابھر رہا تھا کہ علامہ کے جو اجداد تھے، وہ برہمن تھے اور عجیب بات یہ ہے کہ ہندوستان کی آزادی کا باعث بھی برہمن ہوئے اور پاکستان کے تصور کا خالق (بھی برہمن زادہ ہے) ان دلوں یہ سوچ بار بار مجھے پریشان کر رہی تھی کہ اقبال کے تصور پاکستان میں کیا کسی قسم کی برہمنیت کا عنصر کار فرما تھا ؟ کیونکہ ان کا ایک فارسی شعر بھی ہے، جس کا مطلب ہے کہ ہندوستان میں مرزا وغیرہ جو سب سوچنے والے ہیں، وہ ایک دوسرے کے ساتھ چمٹ گئے ہیں، اور اگر کوئی روم و تبریز کے حالات جانتا ہے، تو وہ یہی برہمن زادہ ہے۔ بہر کیف اسی سوچ میں غلطاں و پیچاں ایک رات میں سو گیا، تو حضرت علامہ مجھے خواب میں دکھائی دئے۔ تین اور چار بجے کا درمیانی وقت تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں اس مکان کی چھت کی منڈیر پر کھڑا ہوں اور میرے سامنے بہت سے کاغذات بکھرے پڑے ہیں۔ اسی اثنا میں حضرت علامہ سامنے سے آتے ہیں، انھوں نے دھوتی اور بنیان پہن رکھی ہے، جو ان کا شب خوابی کا لباس تھا۔

کچھ ناراض ناراض سے دکھائی دیتے ھیں اور مجھے دیکھ کر انگریزی(۱) میں کہتے ھیں: یہ کیا تم ھر وقت لکھتے اور سوچتے رھتے ھو؟

میں نے عرض کیا: اپنی طرف سے میرا ضمیر جو کہتا ھے، سوچتا ھوں کہ آپ کے نظریات کیا تھے، میں انھیں سمجھنے کی سعی کر رھا ھوں، تاکہ انھیں احاطہ تحریر میں لاؤں۔

اس کے بعد خواب کا تسلسل ٹوٹ جاتا ھے اور میں محسوس کرتا ھوں کہ جیسے کسی درخت پر چڑھا ھوا ھوں، جس کی شاخوں میں بہت سے کاغذات بکھرے ھوئے ھیں اور میرے ساتھ کوئی اور مدد گار ھے اور ھم دونوں ان شاخوں سے کاغذات کو اکٹھا کر رھے ھیں۔ اس عمل کے دوران میں شکایتاً دوسرے شخص کو کہتا ھوں، جس کو میں Identify نہیں کر سکا کہ صاحب میں اپنے والد کے بارے میں اتنا پڑھتا ھوں، لکھتا ھوں، سوچتا ھوں اور اپنی طرف سے پوری کوشش کرتا ھوں کہ ان کے افکار کو سمجھوں، لیکن یہ مجھ سے کچھ نالاں سے ھیں، میرا خیال ھے کہ انھیں میرے کام پر اعتماد و اطمینان نہیں ھے۔

ابھی میری بات مکمل نہیں ھوتی کہ خواب کا تسلسل خواب میں پھر سے قائم ھوجاتا ھے اور مجھے حضرت علامہ دوبارہ دکھائی دیتے ھیں اور پھر انگریزی ھی میں مجھ سے مخاطب ھوتے ھیں: اچھا جو تم سوچ رھے ھو، اس کے متعلق تمھیں میرا نقطہ نگاہ کل تک معلوم ھوجائے گا۔ یہ سنتے ھی ایک ھلکی سی مسکراھٹ کے ساتھ معاً میں بیدار

(۱) اقبال جب غصے میں ھوتے تو انگریزی میں اور جب خوشگوار موڈ میں ھوتے تو اردو میں گفتگو فرماتے۔

ہوگیا اور سوچنے لگا کہ عجیب و غریب خواب ہے، اپنے طور پر میں نے اس کی تعبیر کی بہت کوشش کی۔ میں نے دل ہی دل میں کہا کہ یقینی بات ہے کہ میں سوچ رہا ہوں کہ علامہ کے ہاں ان کی فطرت یا نہاد میں برہمنیت کا کس قدر دخل تھا ؟ غالباً حضرت علامہ کو یہ بات پسند نہیں آئی، اس لئے وہ کچھ ناراض ناراض دکھائی دئے ہیں۔ پھر میں نے سوچا کہ خواب میں درخت کی شاخوں پر بکھرے ہوئے جو کاغذات میں نے دیکھے ہیں، وہ بھی فکر انگیز گوشوں کی نشاندھی کرتے ہیں۔ درخت سے مراد تو ہمیشہ شجرہ نسب لیا جاتا ہے اور ان دنوں یہی مسئلہ میرے لئے تحقیق طلب تھا کہ علامہ کے اجداد کیا تھے ؟ ان کے ہندوانہ نام یا گوتیں کیا تھیں وغیرہ وغیرہ ؟ — لیکن حضرت علامہ کی ناراضی سے قطع نظر میں کل تک ان کے جواب ملنے کے بارے میں بڑا پر امید تھا اور یہی امر میرے لئے خوشی کا باعث تھا۔

دوسرے روز میں کافی دیر تک عدالت کے کاموں میں مصروف رہا اور سارا دن اسی بات کا منتظر رہا کہ کب وہ لمحہ آئے اور مجھے کچھ معلوم ہو۔ شام سے رات ہوگئی اور رات کے بھی گیارہ بج گئے۔ میری بیوی یہ کہہ کر سونے کے لئے چلی گئیں کہ ابھی بارہ نہیں بجے، شاید اس دوران آپ کو کوئی اشارہ مل جائے۔ مگر میری ذہنی کیفیت دگرگوں تھی۔ میں اسی پریشانی کے عالم میں کبھی اس کمرے میں کبھی اس کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ بارہ بجنے میں چند منٹ باقی تھے کہ میرے قدم اتفاقاً میری ذاتی لائبریری کی طرف اٹھ گئے اور میں کتابوں کی اس الماری کے سامنے جاکر کھڑا ہوگیا، جہاں حضرت علامہ کی حیات اور فکر کے موضوعات پر بہت سی کتابیں جمع ہیں۔ اس دوران میں

میری نظر اچانک ایک کتاب پر پڑی۔ یہ فقیر وحید الدین صاحب کی ''روزگار فقیر،، تھی۔ میں نے اس کتاب کو اٹھایا اور پریشانی کے عالم میں اس کو کھولا، تو سب سے پہلے وھی اوراق باصرہ نواز ھوئے، جہاں حصرت علامہ کے سلسلہ اجداد کا ذکر کرنے کے بعد یہ شعر لکھا ھوا تھا ع

ماتھے پہ جو اسلام کا ٹیکہ ھے اقبال
پنڈت مجھے کوئی کہتا ھے تو شرم آتی ھے

اس شعر کو پڑھتے ھی فوراً میرے دل نے کہا کہ حضرت علامہ نے مجھے میرے سوال کا جواب دے دیا ھے۔ اس وقت مجھے یہ احساس ھوگیا کہ میری سوچ غلط ھے اور میں اپنی فکر کو برھمنیت پر مرتکز نہ کروں، بلکہ اس حقیقت کی طرف آؤں، جس کا ذکر حضرت علامہ نے اپنے مذکورہ شعر میں کیا ھے۔

(جاری ھے)